مختصر افسانہ

مختصر افسانہ انگریزی اصطلاح (Short Story) کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے لیے بالعموم افسانہ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی افسانوی صنفِ ادب ہے جس میں کسی خاص کردار، واقعے یا تجربے کے کسی ایک پہلو کو مکمل طور پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اسے ایک ہی نشست یعنی آدھ گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹے میں پڑھا جا سکے۔

ناول نگار کی طرح افسانہ نگار کا موضوع بھی زندگی ہوتا ہے لیکن اپنی وسعتوں اور پیچیدگیوں سمیت نہیں بلکہ افسانہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی نقاب کشائی کرتا ہے، پوری زندگی کی بجائے صرف ایک گوشے کی جھلک دکھاتا ہے۔ افسانے کی کامیابی کا انحصار موضوع کی عمدگی پر ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو روزمرہ زندگی سے اپنا موضوع منتخب کرنا چاہیے۔

وحدتِ تاثر مختصر افسانے کی بنیادی شرط ہے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ افسانہ قاری کے ذہن پر ایک اور صرف ایک اثر چھوڑے جسے نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ کہانی میں دلچسپی کا مرکز ایک اور صرف ایک ہو ورنہ تاثر تقسیم ہو جائے گا اور اس کی شدت میں بھی کمی آ جائے گی۔ وحدتِ تاثر کا، اختصار کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ مختصر افسانے میں اختصار کے معنی یہ ہیں کہ ایسے تمام واقعات، بیانات، مناظر، مکالمے اور کرداروں کو کہانی میں شامل کرنے سے گریز کیا جائے جو وحدتِ تاثر کی راہ میں حائل ہوں اور قاری کی توجہ کو منتشر کرنے کا باعث بنیں۔ مثال کے طور پر افسانے میں زیادہ کرداروں کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ افسانے کا پلاٹ اور کہانی مختصر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو پورا افسانہ صرف ایک ہی کردار پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح مکالموں میں شاعرانہ تراکیب کے استعمال سے انھیں طوالت دینے کی گنجائش بھی افسانے میں نہیں ہوتی، اس لیے افسانہ نگار چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتا ہے۔

دلچسپی کا عنصر بھی افسانے میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اگر افسانے کی کہانی یا پلاٹ دلچسپ نہ ہو اور اس میں بھرپور تجسس نہ ہو تو قاری افسانے کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ اسی طرح افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ افسانہ نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اُسے نہایت مختصر وقت میں قاری تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے افسانے میں واقعات کی بھرمار نہیں ہوتی، نہ کرداروں کا تفصیلی مطالعہ ہوتا ہے اور نہ ہی طویل مکالمے ہوتے ہیں۔ گویا ہر پہلو سے ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

مختصر افسانہ بھی اردو زبان میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے اردو افسانے کے اولین نمونے پیش کیے۔ علی عباس حسینی، سدرشن اور اعظم کریوی نے پریم چند کی ادبی روایت کو قائم رکھا۔ اس کے بعد حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، رشیدہ جہاں، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کے علاوہ کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور ممتاز مفتی تقسیم سے قبل افسانے کی دنیا میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے نمایاں افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، غلام الثقلین نقوی، مسعود مفتی، قدرت اللہ شہاب، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، منشا یاد، انور سجاد، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ شامل ہیں۔

منشی پریم چند

سالِ ولادت:۱۸۸۱ء　　سالِ وفات:۱۹۳۶ء

پریم چند ضلع بنارس کے موضع پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام دھنپت رائے اور قلمی نام پریم چند ہے۔ ان کے والد منشی عجائب لال پانڈے پور کے رہنے والے تھے اور ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ پریم چند کی زندگی کا آغاز بڑے حوصلہ شکن حالات سے ہوا۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے ظلم وستم کے باوجود انھوں نے فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے حاصل کی اور پھر بنارس کے ایک سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے محکمہ تعلیم میں ملازمت حاصل کر لی مگر ساتھ ساتھ حصولِ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ انھوں نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان بھی پاس کر لیا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچ گئے۔ آپ کی شادی پندرہ برس کی عمر ہی میں ہوگئی تھی۔

۱۹۰۱ء سے ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا جو تاحیات جاری رہا۔ ۱۹۰۹ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' کے نام سے شایع ہوا جس پر حکومت نے پابندی لگا کر اس کی تمام کاپیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترکِ موالات کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ کافی عرصہ تک نول کشور پریس میں ایک ہندی رسالہ ''مادھوری'' کے معاون مدیر رہے۔ اس کے بعد ہفتہ وار پرچہ ''جاگرن'' نکالا جو زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور اسے بند کرنا پڑا۔ انھوں نے بنارس میں ذاتی پریس قائم کیا اور ایک ماہنامہ ''ہنس'' جاری کیا۔ یوں ان کی ساری زندگی مشکلات اور معاشی حالات کو بہتر بنانے کی ناکام کوشش میں گزری۔ بالآخر صحت جواب دے گئی اور وہ ۱۹۳۶ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

پریم چند نے بہت سے افسانے اور ناول لکھے۔ ان کے اہم افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن''، ''زادِ راہ''، ''پریم پچیسی''، ''پریم بتیسی''، ''پریم چالیسی'' اور ناول ''میدانِ عمل''، ''گئودان''، ''نرملا''، ''بازارِ حسن'' اور ''بیوہ'' ہیں۔

پریم چند نے اُردو ادب کو افسانہ نگاری سے متعارف کروایا۔ گویا فنِ افسانہ نگاری نے انھی کی وجہ سے عروج پایا۔ ان کے افسانوں میں انقلاب کی دستک سنائی دیتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' حکومت نے ضبط کر لیا۔ ان کے افسانوں میں ہندوستان کے کسانوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا کیونکہ یہی طبقہ تعداد میں زیادہ ہے اور اگر انھیں بیدار کر لیا جائے تو آزادی کی منزل قریب آ سکتی ہے۔ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مخالف تھے۔ اسی لیے وہ غریب طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے حقائق کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں کیونکہ انھوں نے سنی سنائی باتوں کو پیش کرنے کی بجائے وہی لکھا جس کا براہِ راست مشاہدہ یا خود تجربہ کیا۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں سچائی اور خلوص کا جذبہ کارفرما ہے۔

پریم چند کی زبان سادہ ہے۔ اس میں ہندی و فارسی زبان کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات کے ذریعے تحریروں میں رنگینی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور مقامی واقعات وحقائق کو موضوع بنا کر تحریروں میں مقامی رنگ بھی پیدا کر دیا ہے۔ ان کی تحریروں کی بنیاد معاشرتی مسائل، نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ پر ہے۔ ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہیں جن میں تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قریباً ہر عمر اور پیشے سے متعلق کردار پیش کیے ہیں۔

شاملِ کتاب افسانہ ''زیور کا ڈبا'' ان کا نہایت اہم افسانہ ہے۔ اس میں طبقاتی تضاد کو پیش کیا گیا ہے جس میں ایک طبقے کے پاس بہت سرمایہ ہے جو زندگی کی تمام نعمتیں فوراً حاصل کر سکتا ہے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو سسک سسک کر زندگی کی گاڑی کو دھکیلتا ہے اور بالآخر اس کی ایمانداری کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ بے ایمانی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پرکاش دوسرے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو انتہائی ایمان دار ہونے کے باوجود بے ایمانی پر مجبور ہو جاتا ہے مگر بیوی کے سمجھانے پر اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور وہ اپنی غلطی کی تلافی کرتا ہے..... چونکہ پریم چند کی اپنی زندگی بھی بڑی مشکلات کا شکار رہی اس لیے یہ تمام کشمکش اس کی ذاتی زندگی کی جھلک دکھاتی ہے۔

زیور کا ڈبّا

(۱)

بی۔اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا' وہ مٹی میں مل گئے۔والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزراوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔والد نے کوئی بھی جائیداد نہ چھوڑی' الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر لاد دیا۔چندر پرکاش کو تیس روپے کی نوکری کرتے شرم تو آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔پختہ' ہوادار' صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ۔ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔کام صرف دو گھنٹے کا تھا' لڑکا تو لگ بھگ انھی کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن' کام چور' ابھی نویں درجے میں پڑھتا تھا۔سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا لڑکا ہی سمجھتے تھے۔گویا وہ ملازم نہیں' گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملے میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کا وقت تھا' پرکاش نے اپنے شاگرد ویرا ندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا ''ابھی نہ جاؤ بیٹا' ذرا میرے ساتھ آؤ' تم سے کچھ کہنا ہے۔''

پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اومادیوی نے کہا ''تمھاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کر دوں' ایک بہت اچھے گھر سے پیغام آیا ہے۔''

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا ''میں اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔''

''سب تیاریاں تمھیں کرنی پڑیں گی' یہ سمجھ لو۔''

''تو میں کب انکار کرتا ہوں۔''

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا۔ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھ میں تھا۔دس بارہ ہزار روپیا خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہ تھی۔دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا۔کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔کہیں محلے کا بنیا اسے گھیرے ہوئے ہے۔کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔وہ چاہتا تو دو چار سو روپیا آسانی سے اڑا سکتا تھا لیکن وہ اتنا کمینہ نہ تھا۔پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے' اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آ کر چمپا سے بولا۔ ''ہم تم یہاں روٹیوں کے محتاج' اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں کا زیور بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی ''اونھ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنھیں ایشور نے دیا ہے' وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔''

چندر پرکاش: ''یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا' باپ دادا چھوڑ گئے ہیں' مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔

چمپا: ''اپنا اپنا مقدر ہے۔ تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روز مرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے؟''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی۔

''یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی۔''

چمپا مسکرا کر بولی۔ ''چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی۔ گزر ہوتی جائے' یہی بہت ہے۔''

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ ''اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں' مجھے اس کی امید نہ تھی۔''

چمپا نے کہا ''کوئی اور بات کرو۔ زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔''

''ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔ ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار ہیں۔ یہ نہ ہوا کہ کہتے' اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے بھی لیتے جاؤ۔''

''تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''اس میں بچپن کی کیا بات ہے؟ کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔''

''میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا' جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔''

رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آئی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔

یکا یک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں، پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آ گیا۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس کی چھت سے ملی ہوئی تھی' بیچ میں ایک فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا کہ پہلے زینے سے اتر کر کمرے میں چلوں' اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا'' کیسا چرکا دیا۔'' کہ دوں گا'' میری چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا' اس لیے میں اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے۔'' کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا:'' صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے؟' میں صاف نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد پھر دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔''

پھر بھی وہ جب زینے سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا'' بڑا غضب ہو گیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبا اٹھا کر لے گئے۔''

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا۔'' کسی نے پکڑا چور کو؟''

'' کسی کو خبر بھی نہیں۔ وہی ڈبا لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑا لی اور کیسے انھیں معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبا رکھا ہے۔''

'' نوکروں کی کارستانی ہوگی' باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔''

'' نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔''

'' نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے' آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔''

'' تم جا کر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بیچاری رو رہی ہیں..... تمھارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارہ مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور مونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

پرکاش جھٹ پٹ اٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا۔'' یہ تو بڑا غضب ہوا ماتا جی! مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔''

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے'' کہیں سیندھ نہیں' کوئی تالا نہیں ٹوٹا' کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ چور آیا کدھر سے؟''

ٹھکرائن نے رو کر کہا۔'' میں تو لٹ گئی بھیا! بیاہ سر پر ہے۔ کیا ہوگا؟

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا'' مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

ٹھکرائن نے مخالفت کی'' ارے نہیں بھیا! نوکروں میں ایسا کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یوں ہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔''

ٹھاکر صاحب نے ناک سکیڑ کر کہا'' تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جایا کرتا ہے۔ جس نے اب تک چوری نہیں کی' چوری نہ کرے گا' یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے

جوتے پڑیں گے تو آپ اقبالِ جرم کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں گے تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرانا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا "تم بھی بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔"

پرکاش: لیکن میں تو بیٹھنے والا نہیں۔ میں انھی نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔"

ٹھکرائن: "نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو بھی مجھے یہی خیال رہے گا کہ کسی باہر کے آدمی کا کیا ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو، پر چور آیا باہر سے۔ تمھارے کوٹھے سے بھی تو آ سکتا ہے۔"

ٹھاکر: "ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو۔ شاید کچھ نشان ہوں۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟"

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا "میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں، کوئی پہلے ہی موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔"

تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ "اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔"

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتا لگ جانے سے کیا؟ مال تو جانا تھا، وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپے کی کوئی تجویز کرنی ہوگی۔"

پرکاش: "میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

ٹھاکر: "کیوں اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔"

پرکاش: "آپ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر پر ہے۔"

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا "بڑا لائق آدمی ہے۔ چور ادھر سے آیا۔ یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے، تو کچا ہی کھا جائے۔"

(۵)

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے سے خدشہ تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا "ایک سیٹھ کے ہاں ۵۰ روپے ماہوار کا کام مل گیا ہے مگر وہ روپے میں ان ہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہوگی۔"

خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پا کر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا' وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک' صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا۔ اس کی چابی کہاں ہے؟ اس کا چمپا کو پتا نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں'' کچھ نہیں پرانی کتابیں ماری ماری پھرتی تھیں' اٹھا کر صندوق میں بند کر دی ہیں۔'' چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے لگی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ شبہے کا انکھوا سا نکلا' مگر پانی نہ پا کر سوکھ گیا۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر سے آتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی۔ اس دن سے پرکاش کمرے ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا گرمی کے مارے دم گھٹتا۔ چمپا نے کئی بار باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے؟

ایک دن چمپا نے کمرے میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا ''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔

بولی،'' میں کیوں ہٹانے لگی۔''

''پھر کس نے ہٹایا۔''

''گھر میں تم رہتی ہو۔''

''اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

'' کچھ نہیں یوں ہی پوچھا تھا۔''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں نہ دیکھ لیں' پرکاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی' وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر بہلانے کے لیے بولا:

''طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا پکوڑیاں ہیں؟''

آج چمپا کے دل میں شبہے کا وہ انکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے' یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ چابی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خریدی اور صندوق کھول ڈالا۔'' ارے' یہ تو زیور ہیں۔'' معاً اس کے دل میں خیال گزرا' یہ زیور ٹھاکر صاحب کے تو نہیں؟'' چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا۔ لیکن شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے یک دم صندوق بند کر دیا اور

پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ''ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟''

(۶)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے اسے وہ محبت نہ رہی' نہ وہ عزت کا جذبہ۔ بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ تب دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے تھے' مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے' آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ مینجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکونٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟

پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا: ''تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟''

پرکاش نے سر جھکا لیا۔ ''دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں؟''

''اجی درخواست تو دو' اگر سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کا فکر نہ کرو۔''

پرکاش نے حیران ہو کر کہا۔ ''آپ نقد ضمانت داخل کر دیں گے؟''

''ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے؟''

پرکاش گھر کی طرف چلا تو اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینے پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آ کر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک منٹ بعد بولی:

''ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی؟ جگہ نہ ملتی نہ سہی' روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔''

''یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی' کیا میں ایسا اناڑی ہوں۔''

چمپا نے کہا۔ ''آدمی کی نیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔''

پرکاش سناٹے میں آ گیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اسے کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے؟ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا ''تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟'' جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا ''کچھ نہیں، میں نے دنیا کی بات کی تھی۔''

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

''کیا جتنے آدمی بینک میں ملازم ہیں ان کی نیت بدلتی رہتی ہے؟''

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا ''تم تو زبان پکڑتے ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی ہی میں تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے، سو دو سو روپے کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔''

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا، مسکرا کر بولا۔ ''اچھا تمھارا اشارہ اس طرف تھا لیکن میں نے کمیشن کے سوا ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔''

چمپا نے نفرت کے لہجے میں کہا ''جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے، اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی لینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ تمہاری شرافت تو جب جانتی تم کمیشن کے روپے لے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ان چھے مہینوں میں انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے۔ کچھ یاد ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ ۲۰ روپے ماہوار دیے جاتے ہیں۔ علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے، تمھارے لیے ضرور بھیجتے ہیں۔ تمھارے پاس گھڑی نہ تھی۔ اپنی گھڑی تمھیں دے دی۔ تمھاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ تمھاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیے۔ اسے تم چھوٹی سی بات سمجھتے ہو؟ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔''

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا، اکٹھا ہو کر نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے۔ تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے، افسوس! چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔

(۷)

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، ویرا اندر اور اس کی نئی دلھن بھی آئے ہوئے ہیں۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا ''آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا دادا! میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔''

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے، رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں۔ تین عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر صندوق میں سے زیورات کا ڈبا نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی

طرح تھرتھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا ڈر تھا' آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا' حرارت' اضطراب اور خلش سے پُر' اب بخار کا اتار تھا' سکون' فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا۔ آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویر اندر کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبا رکھ دیا۔ پھر فوراً باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ آیا۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی' گویا کہ کسی گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبے کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو دیر و سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش رات کو پڑھانے جایا کرتا تھا آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا' وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویر اندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا ''بابو جی! کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی' جو زیور چوری ہو گئے تھے' سب مل گئے۔''

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے ''بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری' پورے کا پورا ڈبا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی' جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔''

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے' جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھے ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبا کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا ''تعجب کی بات ہے میری عقل تو کام نہیں کرتی۔''

ٹھاکر: ''کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی! تمھاری ہی کیوں' ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا ہے۔''

ٹھاکر: ''آج اسی خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔''

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی' جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ''آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔''

''میں ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔''

''تم تو سیکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔''

''مجھے تو اتنی خوشی ہوئی ہے کہ لاکھوں خرچ کرنے سے بھی ارمان پورا نہ ہو گا۔''

پرکاش کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

(زادِ راہ)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- پرکاش کو ٹیوشن کیوں کرنی پڑی؟

ii- ویرو بابو کی شادی کے سلسلے میں پرکاش نے کیا مشورہ دیا؟

iii- پرکاش نے زیور کا ڈبا کس جذبے کے تحت چوری کیا؟

iv- زیور کے ڈبے کو اپنے گھر میں دیکھ کر چمپا کے کیا احساسات تھے؟

v- ''زیور کا ڈبا'' سے کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے؟

2- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں:

i- ''زیور کا ڈبا'' کا مصنف کون ہے؟

ا۔ غلام عباس ب۔ ممتاز مفتی

ج۔ پریم چند د۔ اشفاق احمد

ii- ''زیور کا ڈبا'' کا اہم ترین کردار کون ہے؟

ا۔ پرکاش ب۔ چمپا

ج۔ ویراندر د۔ ٹھاکر

iii- پرکاش نے زیور کا ڈبا کیوں واپس کیا؟

ا۔ بیوی کے کہنے پر ب۔ ٹھاکر کے کہنے پر

ج۔ ویراندر کی خاطر د۔ اپنے ضمیر کی آواز پر

3- مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر اُن کے آنسو پونچھ دیے۔

ii- جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

iii- شبے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی نہ پا کر سوکھ گیا۔

iv- دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اُسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔

v- اپنا اپنا مقدر ہے ایشور کا کیا قصور!

4- ''زیور کا ڈبا'' میں ہندی کے کچھ ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر اردو میں استعمال نہیں ہوتے۔ مثلاً گہنے اور مونڈی کاٹا وغیرہ۔ آپ ایسے ہی چند اور الفاظ تلاش کر کے ان کے معنی لکھیں۔

5- مختصر افسانے کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند کے اس افسانے کا اسی نقطہ نظر سے مختصر جائزہ لیں۔

6- ''زیور کا ڈبا'' میں پرکاش، چمپا اور ٹھاکر صاحب کے کردار اہم ہیں۔ ان میں سے اپنے پسندیدہ کردار کا مختصراً جائزہ لیں۔

7- ''زیور کا ڈبا'' کا موضوع پرکاش اور چمپا کی مثالی محبت ہے یا زیور کا ڈبا؟ مختصراً جائزہ لیں۔

8- ''زیور کا ڈبا'' کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیں۔